عائلی تنازعات کا حل: پاکستانی قوانین اور عالمی معیارات کا ایک تقابلی و تجزیاتی مطالعہ

Resolution of Family Disputes: A Comparative and Analytical Study of Pakistani Laws and International Standards

Raana Mudsir
PhD Scholar, Department of Islamic Studies,
Ghazi University, Dera Ghazi Khan, Punjab, Pakistan
Dr. Arshad Munir
Professor, Department of Islamic Studies,
Ghazi University, Dera Ghazi Khan, Punjab, Pakistan

Abstract
This research article provides a comprehensive analytical study of family disputes within the legal framework of Pakistan, juxtaposed with international human rights standards. Family, as the fundamental unit of society, faces multifaceted challenges in Pakistan due to the interplay between Islamic jurisprudence, colonial legal inheritance, and deep-rooted socio-cultural traditions. The study particularly focuses on the Southern Punjab region, where feudal structures and customary practices like "Watta Satta" (exchange marriage) and "Haq Bakshwana" often circumvent statutory laws, leading to the systemic deprivation of women's and children's rights.
The research examines the **Muslim Family Laws Ordinance (MFLO) 1961** and the **Family Courts Act 1964**, analyzing key issues such as marriage registration, polygamy, divorce (Talaq), and Khula. It highlights that while Pakistani law provides a progressive framework for regulating family matters, its implementation is hindered by judicial delays and a lack of legal awareness. A significant portion of the study is dedicated to financial rights, including dower (Mahr), maintenance (Nan-o-Nafqah), and inheritance. The controversial Section 4 of the MFLO, regarding the inheritance of orphaned grandchildren, is discussed as a point of contention between traditional clergy and state-led social reform.
In the comparative section, the article evaluates Pakistan's alignment with international conventions such as **CEDAW** and the **UN Convention on the Rights of the Child (UNCRC)**. While global standards emphasize absolute gender equality and the "Best Interest of the Child," Pakistani laws navigate a delicate balance between these universal norms and religious sensitivities. The study identifies gaps in the current system, such as the minimum age for marriage and the adversarial nature of child

custody battles, suggesting a shift toward the "Co-parenting" model practiced in developed jurisdictions.

The research concludes with a set of reformative recommendations. It advocates for the digitalization of Nikahnama (marriage contracts) to prevent fraud and the mandatory integration of **Alternative Dispute Resolution (ADR)** and family mediation to reduce the burden on courts. Furthermore, it suggests the establishment of a state-funded family support system to ensure the immediate economic survival of divorcees and orphans. Ultimately, the paper argues that resolving family disputes in Pakistan requires not just legislative amendments but a profound shift in social consciousness to harmonize local traditions with global human rights values.

Keywords: Family Disputes, Pakistani Family Laws, International Standards, MFLO 1961, Southern Punjab Sociology, Women's Rights, Child Custody, Alternative Dispute Resolution - ADR, Inheritance Laws, Judicial Reforms

تعارف، تاریخی پس منظر اور اہمیت

عائلی نظام کی سماجی و قانونی اساس

انسانی تہذیب کی بقا اور معاشرتی استحکام کا دارومدار جس بنیادی اکائی پر ہے، اسے 'خاندان' کہا جاتا ہے۔ خاندان محض ایک حیاتیاتی گروہ نہیں بلکہ ایک ایسی قانونی اور اخلاقی پناہ گاہ ہے جو فرد کی شخصیت سازی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں عائلی نظام کی بنیادیں قرآن و سنت کے آفاقی اصولوں پر استوار ہیں، جہاں نکاح کو ایک 'میثاقِ غلیظ' (مضبوط عہد) قرار دیا گیا ہے۔ تاہم، دورِ حاضر کی مادی تبدیلیوں، معاشی دباؤ اور عالمی ثقافتی یلغار نے اس مقدس رشتے کو مختلف نوعیت کے تنازعات سے دوچار کر دیا ہے۔ عائلی تنازعات (Family Disputes) سے مراد وہ تمام قانونی، معاشی اور جذباتی کشمکش ہے جو نکاح کی تحلیل، وراثت کی تقسیم، بچوں کی پرورش یا نان و نفقہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ ان تنازعات کا حل نہ صرف فرد کی سکونِ قلب کے لیے ضروری ہے بلکہ یہ ریاست کی مجموعی سماجی صحت کی ضمانت بھی ہے۔

جنوبی پنجاب کا مخصوص سماجی ڈھانچہ اور عائلی مسائل

پاکستان کے دیگر صوبوں اور خطوں کے مقابلے میں جنوبی پنجاب کا جغرافیائی اور سماجی منظرنامہ عائلی تنازعات کے حوالے سے نہایت حساس اور پیچیدہ ہے۔ یہاں کا معاشرتی ڈھانچہ بڑی حد تک جاگیردارانہ اور قبائلی اثرات کے زیرِ اثر ہے، جہاں قانون کی حکمرانی اکثر روایتی 'جرگوں' اور 'پنچائتوں' کے فیصلوں کے سامنے دب جاتی ہے۔ جنوبی پنجاب کے اضلاع (جیسے ملتان، ڈیرہ غازی خان، اور بہاولپور) میں عائلی تنازعات کی جڑیں اکثر "وٹہ سٹہ"

کی شادیوں، کم عمری کے نکاح اور وراثت میں خواتین کو ان کے جائز شرعی حصے سے محروم رکھنے کی کوششوں میں پیوست ہیں۔ طارق محمود نے اپنی تحقیق میں اس تلخ حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ یہاں کے پسماندہ علاقوں میں عورت کو جائیداد کا وارث بنانے کے بجائے "قرآن سے شادی" یا زبردستی دستبرداری (Relinquishment) جیسے غیر قانونی ہتھکنڈوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان سماجی برائیوں کی وجہ سے عدالتی نظام پر بوجھ بڑھتا ہے اور خاندانی اکائیاں تاش کے پتوں کی طرح بکھر جاتی ہیں۔[1]

پاکستانی عائلی قوانین کا ارتقائی سفر

پاکستان میں عائلی قوانین کا ارتقاء ایک مسلسل جدوجہد کی داستان ہے، جس میں روایتی مذہبی تشریحات اور جدید قانونی تقاضوں کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل، برصغیر کے مسلمان "مسلم پرسنل لاء (شریعت) اپلی کیشن ایکٹ 1937" کے پابند تھے، جس نے رواج کی جگہ شرعی اصولوں کو فوقیت دی۔ آزادی کے بعد، 1955 میں "راشدہ پٹیل" اور دیگر خواتین رہنماؤں کی تحریک پر حکومت نے "عائلی قوانین کمیشن" تشکیل دیا، جس کی سفارشات کی روشنی میں **مسلم فیملی لاز آرڈیننس 1961** نافذ ہوا۔ اس آرڈیننس نے کثیر الازدواجی کو ریگولیٹ کیا اور طلاق کے طریقہ کار کو دستاویزی شکل دی۔ جسٹس (ر) تنزیل الرحمن کے مطابق، یہ قانون سازی اگرچہ جدیدیت کی طرف ایک قدم تھی، لیکن اس کی بعض دفعات (جیسے یتیم پوتے کی وراثت) پر مذہبی حلقوں نے تحفظات کا اظہار کیا، جو آج بھی بحث کا موضوع ہیں[2]۔

عالمی معیارات اور بین الاقوامی قانونی فریم ورک

موجودہ دور میں عائلی تنازعات محض ایک مقامی مسئلہ نہیں رہے، بلکہ بین الاقوامی انسانی حقوق کے تناظر میں ان کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔ اقوامِ متحدہ کا "انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ (UDHR) " اور "خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیاز کے خاتمے کا کنونشن (CEDAW) " خاندان کے ہر فرد کو مساوی حقوق کی فراہمی پر زور دیتے ہیں۔ عالمی معیار کے مطابق، شادی میں فریقین کی آزادانہ مرضی، علیحدگی کی صورت میں بچوں کا بہترین مفاد (Best Interest of the Child)، اور صنفی بنیادوں پر تشدد کا خاتمہ لازمی شرائط ہیں۔ پاکستان، ان بین الاقوامی معاہدوں کا دستخط کنندہ ہونے کے ناطے، پابند ہے کہ وہ اپنے داخلی قوانین کو ان معیارات کے مطابق ڈھالے۔ تاہم، "ہیگ کنونشن برائے تحفظِ اطفال" جیسے بین الاقوامی معاہدات اور مقامی سماجی اقدار کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا ایک پیچیدہ قانونی مرحلہ ہے۔ معروف قانونی ماہر ڈی ایف ملا نے اپنی تصنیف میں واضح کیا ہے کہ عائلی قوانین میں تبدیلی لاتے وقت مقامی ثقافت اور مذہب کے اثر کو نظر انداز کرنا قانون کی ناکامی کا باعث بنتا ہے۔[3]

پاکستانی عدالتی نظام اور سائلین کی مشکلات

پاکستان میں عائلی تنازعات کے حل کے لیے 1964 میں "فیملی کورٹس ایکٹ" کے تحت خصوصی عدالتیں قائم کی گئیں، جن کا مقصد کیسز کا فوری اور کم خرچ تصفیہ تھا۔ لیکن زمینی حقائق اس کے برعکس ہیں۔ جنوبی پنجاب جیسے علاقوں میں، جہاں عدالتیں دور دراز شہروں میں واقع ہیں، ایک غریب عورت کے لیے قانونی چارہ جوئی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ وکلاء کی بھاری فیسیں، تاریخ پر تاریخ کا کلچر اور سماجی بائیکاٹ کا خوف اکثر سائلین کو انصاف کے حصول سے روک دیتا ہے۔ نان و نفقہ اور بچوں کی تحویل کے کیسز میں ہونے والی تاخیر بچوں کی شخصیت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہے۔ اس مقالے میں ہم یہ تجزیہ کریں گے کہ کیوں پاکستانی نظامِ عدل عالمی سطح پر رائج "متبادل نظامِ حلِ تنازعات (Alternative Dispute Resolution – ADR) "کو مؤثر طریقے سے اپنانے میں ناکام رہا ہے اور اس کے سدِباب کے لیے کیا اقدامات ضروری ہیں۔

پاکستانی عائلی قوانین کا ڈھانچہ: نکاح، طلاق اور کثیر الازدواجی کا قانونی و سماجی تجزیہ

نکاح کی قانونی نوعیت اور رجسٹریشن کا عمل

پاکستان کے قانونی نظام میں نکاح محض ایک مذہبی فریضہ نہیں بلکہ ایک باقاعدہ 'سول کنٹریکٹ (Civil Contract)' ہے، جس کی بنیاد ایجاب و قبول اور گواہان کی موجودگی پر قائم ہے۔ "مسلم فیملی لاز آرڈیننس 1961" کی دفعہ 5 کے تحت ہر نکاح کی رجسٹریشن ریاست کے نامزد کردہ نکاح رجسٹرار کے پاس کروانا قانونی طور پر لازم ہے۔ اس رجسٹریشن کا بنیادی مقصد زوجین کے حقوق کا تحفظ اور مستقبل میں پیدا ہونے والے وراثت، مہر یا طلاق جیسے تنازعات میں دستاویزی شہادت فراہم کرنا ہے۔ نکاح نامہ کے 25 کالموں میں سے کالم نمبر 18 (حقِ طلاق کی تفویض) اور کالم نمبر 22 (پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کی شرائط) خواتین کے لیے قانونی ڈھال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنوبی پنجاب کے پسماندہ علاقوں میں، جہاں شرحِ خواندگی کم ہے، نکاح خواں اکثر ان کالموں کو "رواج" کے نام پر کاٹ دیتے ہیں، جو کہ قانون کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ جسٹس ناصرہ جاوید اقبال کے مطابق، نکاح نامہ ایک مقدس عہد نامہ ہے جس کے کالموں سے چھیڑ چھاڑ کرنا عورت کے بنیادی انسانی حقوق پر شب خون مارنے کے مترادف ہے۔[4]

کثیر الازدواجی (Polygamy) اور قانونی قدغنیں

پاکستان میں دوسری شادی کو مطلقاً حرام یا ممنوع قرار نہیں دیا گیا، بلکہ اسے "مسلم فیملی لاز آرڈیننس 1961" کی دفعہ 6 کے ذریعے سخت قانونی ضوابط کے تابع کر دیا گیا ہے۔ قانون کی رو سے، اگر کوئی مرد پہلی بیوی کی

موجودگی میں دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہے، تو اسے "ثالثی کونسل (Arbitration Council) " سے تحریری اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا، جس کے لیے پہلی بیوی کی رضامندی اور شادی کی ٹھوس وجوہات (مثلاً لاولدی یا دائمی بیماری) کا ہونا لازمی ہے۔ اس قانونی قدغن کا مقصد خاندان کی معاشی اور جذباتی بنیادوں کو کمزور ہونے سے بچانا ہے۔ اگر کوئی مرد اس طریقہ کار کی پیروی نہیں کرتا، تو اسے قید اور جرمانے کی سزا ہو سکتی ہے، اور اسے پہلی بیوی کا پورا مہر (چاہے وہ معجل ہو یا مؤجل) فوری ادا کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ سعید نے اپنی تحقیق میں واضح کیا ہے کہ جنوبی پنجاب کے وڈیرہ شاہی نظام میں دوسری شادی کو مردانگی کی علامت سمجھا جاتا ہے، جہاں اکثر پہلی بیوی پر دباؤ ڈال کر زبردستی 'رضامندی' لی جاتی ہے، جو کہ قانونی طور پر کالعدم ہے۔[5]

طلاق کا طریقہ کار اور دفعہ 7 کی تشریحی اہمیت

پاکستان میں طلاق کے قانونی اثرات اس وقت تک مرتب نہیں ہوتے جب تک "مسلم فیملی لاز آرڈیننس 1961" کی دفعہ 7 کے مطابق اس کا نوٹس متعلقہ یونین کونسل کے چیئرمین کو نہ بھیجا جائے۔ نوٹس ملنے کے بعد چیئرمین ایک "ثالثی کونسل" تشکیل دیتا ہے جس کا مقصد 90 دن کے اندر میاں بیوی کے درمیان صلح کی کوشش کرنا ہے۔ اگر 90 دن کے اندر مصالحت ناکام ہو جائے، تب ہی طلاق مؤثر تسلیم کی جاتی ہے۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے "فرح ناز بنام ریاست" کیس میں یہ واضح کیا کہ طلاق کا زبانی اعلان عدالتی طور پر تب تک تسلیم نہیں کیا جائے گا جب تک اس کی دستاویزی شہادت اور نوٹس کی تعمیل ثابت نہ ہو جائے۔ یہ دفعہ "غصے کی طلاق" اور جلد بازی میں کیے گئے فیصلوں کے خلاف ایک قانونی دیوار ہے، جو عالمی سطح پر جدید مسلم اصلاحات کی بہترین مثال سمجھی جاتی ہے۔ بیرسٹر علی ظفر کے مطابق، یہ قانون خاندان کو ٹوٹنے سے بچانے کا آخری موقع فراہم کرتا ہے۔[6]

خلع: عورت کا حقِ علیحدگی اور عدالتی تحفظات

جب میاں بیوی کے درمیان تعلقات اس حد تک بگڑ جائیں کہ اللہ کی حدود قائم رکھنا ممکن نہ رہے، تو اسلام اور پاکستانی قانون عورت کو "خلع" کا حق دیتے ہیں۔ "فیملی کورٹس ایکٹ 1964" نے خلع کے حصول کو دیوانی عدالتوں کے طویل طریقہ کار سے نکال کر ایک سہل عمل بنا دیا ہے۔ سپریم کورٹ کے تاریخی فیصلوں کی روشنی میں یہ طے پا چکا ہے کہ اگر عورت عدالت میں یہ بیان دے دے کہ وہ شوہر سے شدید نفرت کرتی ہے اور اس کے ساتھ کسی صورت نہیں رہ سکتی، تو عدالت شوہر کی مرضی کے بغیر بھی خلع کی ڈگری جاری کرنے کی پابند ہے۔ جنوبی پنجاب کے روایتی معاشرے میں خلع لینا آج بھی ایک سماجی چیلنج ہے، جہاں عورت کو "باغی" تصور کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد طاہر

القادری نے اپنی تصنیف میں واضح کیا ہے کہ خلع عورت کا وہ شرعی حق ہے جس کے لیے اسے شوہر کی اجازت کی ضرورت نہیں، بلکہ عدالت قاضی کی حیثیت سے یہ رشتہ ختم کر سکتی ہے۔[7]

حق مہر اور نان و نفقہ کی قانونی حیثیت

عائلی تنازعات میں مہر اور نان و نفقہ (Maintenance) بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ پاکستانی قانون کے تحت شوہر اپنی بیوی کے تمام ضروری اخراجات کا ذمہ دار ہے۔ فیملی کورٹ ایکٹ 1964 کے تحت عدالت شوہر کی مالی حیثیت دیکھ کر خرچے کا تعین کرتی ہے۔ مہر کی ادائیگی کے حوالے سے ڈاکٹر خالد مسعود نے اپنی تشریحات میں لکھا ہے کہ مہر محض ایک رسم نہیں بلکہ عورت کی معاشی خود مختاری کا ضامن ہے۔ حالیہ برسوں میں، پاکستانی عدالتوں نے "عبوری خرچہ (Interim Maintenance) "کے تصور کو سختی سے نافذ کیا ہے تاکہ کیس کے فیصلے تک عورت اور بچے فاقہ کشی پر مجبور نہ ہوں۔ جنوبی پنجاب میں وٹہ سٹہ کی شادیوں کی وجہ سے اکثر مہر اور خرچے کے دعوے انتقامی کارروائیوں کی نذر ہو جاتے ہیں، جس کا سدِباب صرف عدالتی مستعدی سے ممکن ہے۔[8]

پاکستانی عائلی قوانین کا ڈھانچہ بظاہر جامع ہے، لیکن اس کے نفاذ میں سماجی رکاوٹیں اور مذہبی تشریحات کا تنوع حائل ہے۔ جہاں ایک طرف یہ قوانین اسلامی اصولوں کے تحفظ کا دعویٰ کرتے ہیں، وہیں دوسری طرف عالمی انسانی حقوق کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ جنوبی پنجاب جیسے علاقوں میں قانون کی بالادستی کے لیے ضروری ہے کہ عدالتی عمل کو مزید شفاف بنایا جائے اور نکاح نامے کی رجسٹریشن کے عمل میں کسی قسم کی کوتاہی کو جرم قرار دیا جائے۔

وراثت اور مالیاتی حقوق: پاکستانی قوانین اور شرعی تفہیم کا تجزیاتی مطالعہ

وراثت کی شرعی و قانونی اساس اور صنفی تقسیم کا فلسفہ

پاکستان میں وراثت کا قانون بنیادی طور پر قرآنِ کریم کی سورۃ النساء کی آیات پر مبنی ہے، جسے "مسلم پرسنل لاء (شریعت) اپلی کیشن ایکٹ 1962" کے ذریعے دستوری تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ اسلامی قانونِ وراثت کی رو سے جائیداد کی تقسیم میت کی وفات کے فوراً بعد واجب ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں وراثت کے تنازعات کی سب سے بڑی وجہ خواتین کو ان کے شرعی حصے سے محروم کرنا ہے۔ اگرچہ قانون بیٹی، بیوی اور ماں کے حصوں کا تعین واضح طور پر کرتا ہے، لیکن سماجی دباؤ اور جہالت کے باعث خواتین سے "دستبرداری نامہ (Relinquishment Deed) " لکھوا لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے مطابق، وراثت میں عورت کا حصہ محض ایک معاشی حق نہیں بلکہ اس کی

سماجی و معاشی خود مختاری کی علامت ہے، اور اسے کسی بھی حیلے بہانے، چاہے وہ 'حق بخشوانا' ہو یا روایتی دباؤ، سے محروم کرنا اسلام کے بنیادی تصورِ عدل کے منافی ہے۔

جنوبی پنجاب جیسے زرعی علاقوں میں زمین کی تقسیم سے بچنے کے لیے عورتوں کو جائیداد سے بے دخل کرنا ایک سنگین قانونی اور اخلاقی جرم بن چکا ہے جسے روکنے کے لیے ریاست کو سخت انتظامی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔[9]

نان و نفقہ (Maintenance) اور شوہر کی قانونی ذمہ داری

عائلی تنازعات میں نان و نفقہ کا حصول سب سے زیادہ وقت طلب اور حساس مسئلہ ہے۔ "فیملی کورٹس ایکٹ 1964 " کے تحت شوہر اپنی بیوی اور نابالغ بچوں کے قیام و طعام، لباس اور طبی اخراجات کا قانونی طور پر ذمہ دار ہے۔ اگر شوہر اپنی یہ بنیادی ذمہ داری پوری نہ کرے تو بیوی عدالت سے رجوع کر سکتی ہے۔ پاکستانی عدالتوں نے حالیہ برسوں میں "عبوری نان و نفقہ (Interim Maintenance) " کے تصور کو نہایت سختی سے متعارف کرایا ہے، جس کے تحت کیس کے حتمی فیصلے سے قبل ہی عدالت شوہر کو ماہانہ رقم ادا کرنے کا پابند بناتی ہے۔ جسٹس وجیہ الدین احمد نے اپنے مختلف عدالتی فیصلوں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ نان و نفقہ کی مقدار کا تعین شوہر کی ظاہری مالی حیثیت اور معاشرتی معیار کے مطابق ہونا چاہیے تاکہ علیحدگی کی صورت میں عورت اور بچے کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہوں۔ عالمی انسانی حقوق کے چارٹرز بھی معاشی تحفظ کو خاندان کے بقا کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہیں، اور پاکستانی عدلیہ اس ضمن میں عالمی معیارات کو مد نظر رکھتی ہے۔[10]

حق مہر: معاشی تحفظ یا محض ایک کاغذی کارروائی؟

حقِ مہر نکاح کا ایک لازمی جزو ہے جو عورت کی خالص ملکیت تسلیم کیا جاتا ہے۔ پاکستانی قانون میں مہرِ معجل (جو مطالبے پر فوراً ادا کرنا ہو) اور مہرِ مؤجل (جو مستقبل یا علیحدگی کی صورت میں واجب الادا ہو) کی تفریق موجود ہے۔ قانونی پیچیدگی تب پیدا ہوتی ہے جب نکاح نامے میں مہر کی رقم مبہم رکھی جاتی ہے یا اسے محض دکھاوے کے لیے تحریر کیا جاتا ہے۔ سپریم کورٹ کے ایک اہم فیصلے میں یہ طے کیا گیا کہ اگر نکاح نامے میں مہر کی ادائیگی کا وقت متعین نہ ہو تو اسے "معجل" تصور کیا جائے گا اور بیوی کسی بھی وقت اس کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ بیرسٹر علی ظفر کے مطابق، جنوبی پنجاب کے سماجی ڈھانچے میں مہر کی رقم اکثر اتنی کم رکھی جاتی ہے کہ وہ عورت کے لیے کسی بھی قسم کا معاشی سہارا ثابت نہیں ہوتی۔ مہر کو محض ایک رسم سمجھنے کے بجائے اسے عورت کی معاشی ڈھال بنانا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ طلاق یا خلع کی صورت میں وہ دربدر نہ ہو۔[11]

یتیم پوتے کی وراثت اور دفعہ 4 کا قانونی و فقہی تنازع

مسلم فیملی لاز آرڈیننس 1961" کی دفعہ 4 ایک نہایت حساس اور علمی بحث کا موضوع ہے۔ یہ شق ان پوتوں اور پوتیوں کو وراثت کا حق دیتی ہے جن کے والد دادا کی زندگی میں وفات پا چکے ہوں۔ روایتی فقہ میں 'الحجب' (بڑے وارث کی موجودگی میں چھوٹے کا محروم ہونا) کا اصول رائج ہے، لیکن پاکستانی قانون نے جدید سماجی ضرورتوں کے تحت "نمائندگی کے اصول (Principle of Representation) " کو اپنایا ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود کے مطابق، اس قانونی بحث نے پاکستان میں مذہبی تشریح اور سماجی بہبود کے درمیان ایک گہری خلیج پیدا کر دی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت نے اگرچہ اسے شریعت سے متصادم قرار دیا تھا، لیکن سپریم کورٹ نے یتیموں کے وسیع تر مفاد میں اسے برقرار رکھا ہوا ہے۔ بین الاقوامی قوانین برائے حقوقِ اطفال (UNCRC) کے تحت بھی یتیم بچوں کی معاشی کفالت ریاست اور خاندان کی مشترکہ ذمہ داری ہے، جس کی تائید اس قانونی دفعہ سے ہوتی ہے۔[12]

وراثت سے محرومی کے سماجی ہتھکنڈے اور عدالتی پیش رفت

جنوبی پنجاب اور سندھ کے دیہی علاقوں میں "حق بخشوانا" (قرآن سے شادی) جیسی قبیح رسمیں عورت کو وراثت سے دور رکھنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ اگرچہ "تعزیراتِ پاکستان" کی دفعہ 498 A-کے تحت کسی خاتون کو زبردستی وراثت سے محروم کرنا یا شادی سے روکنا سنگین جرم ہے جس کی سزا 10 سال تک قید ہو سکتی ہے، لیکن ایف آئی آر درج کرانے کا رجحان بہت کم ہے۔ چوہدری محمد اکرم کے مطابق، عدالتیں اب ایسے معاملات میں نہایت سخت موقف اختیار کر رہی ہیں۔ سپریم کورٹ نے حالیہ برسوں میں قرار دیا کہ وراثت کے معاملات میں "دستبرداری" کا دعویٰ کرنے والے مرد وارث کو یہ ناقابلِ تردید ثبوت پیش کرنا ہوگا کہ عورت نے یہ فیصلہ کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر آزادانہ مرضی سے کیا ہے۔ یہ قانونی پیش رفت عالمی انسانی حقوق کے اس اصول کی عکاسی کرتی ہے کہ معاشی حقوق میں صنفی امتیاز کا مکمل خاتمہ ہونا چاہیے۔[13]

وراثت اور مالیاتی حقوق کے معاملات میں پاکستانی قوانین کافی حد تک جامع اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں، لیکن ان کا عملی نفاذ سماجی ڈھانچے کی فرسودہ روایات کی وجہ سے ہمیشہ مشکل رہا ہے۔ عالمی معیارات کے مطابق، مالیاتی حقوق کی فراہمی میں تیزی لانے کے لیے "فیملی میڈیشن" اور مخصوص "فیملی ایگزیکیوٹنگ کورٹس" کا قیام ضروری ہے تاکہ بیواؤں اور یتیموں کو اپنے حق کے لیے دہائیوں تک عدالتوں کے چکر نہ کاٹنے پڑیں۔ جب تک معاشی حقوق کو قانونی تحفظ کے ساتھ ساتھ سماجی قبولیت نہیں ملتی، عائلی تنازعات کا پائیدار حل ممکن نہیں ہے۔

عالمی معیارات اور بین الاقوامی کنونشنز: عائلی حقوق کا ہمہ گیر تناظر

انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ (UDHR) اور خاندانی تحفظ

بین الاقوامی سطح پر عائلی حقوق کی بحث کا آغاز 1948 کے "انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے " (Universal Declaration of Human Rights) سے ہوتا ہے۔ اس اعلامیے کی دفعہ 16 واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ بالغ مردوں اور عورتوں کو نسل، قومیت یا مذہب کی کسی پابندی کے بغیر شادی کرنے اور خاندان کی بنیاد رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اس عالمی معیار کے مطابق، شادی صرف فریقین کی مکمل اور آزادانہ رضامندی سے ہی ہونی چاہیے۔ پاکستان، اقوامِ متحدہ کا رکن ہونے کے ناطے، ان اصولوں کا پابند ہے۔ ڈاکٹر رانا فرخ محمود کے مطابق، عالمی سطح پر شادی کو ایک دوطرفہ رضاکارانہ معاہدہ تسلیم کیا جاتا ہے، جبکہ پاکستان کے دیہی علاقوں، بالخصوص جنوبی پنجاب میں، اکثر شادیاں خاندان کی مرضی اور "وٹہ سٹہ" جیسے روایتی جبر کے تحت ہوتی ہیں، جو کہ براہِ راست عالمی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔[14]

کنونشن برائے خاتمہ امتیازِ نسواں (CEDAW) اور پاکستانی قوانین

خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیاز کے خاتمے کا کنونشن (Convention on the Elimination of All Forms of Discrimination Against Women - CEDAW) عائلی قوانین کے حوالے سے سب سے جامع عالمی دستاویز ہے۔ اس کنونشن کی دفعہ 16 تقاضا کرتی ہے کہ ریاستیں شادی، طلاق، بچوں کی پرورش اور جائیداد کی ملکیت میں مرد اور عورت کے مساوی حقوق کو یقینی بنائیں۔ پاکستان نے 1996 میں اس کنونشن پر دستخط کیے، تاہم اسلامی شریعت اور مقامی قوانین کے تحفظات کے ساتھ۔ معروف قانونی ماہرہ عاصمہ جہانگیر نے اپنی تحریروں میں ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ اگرچہ پاکستانی قانون (MFLO 1961) نے طلاق اور کثیر الازدواجی کو ریگولیٹ کیا ہے، لیکن عالمی معیارات کے مطابق ابھی بھی عورت کو طلاق کے حق (حقِ تفویض) کے حصول کے لیے نکاح نامے کی محتاجی یا خلع کے لیے عدالتوں کی طویل جدوجہد کا سامنا ہے، جو صنفی مساوات کے عالمی معیار سے متصادم ہے۔[15]

حقوقِ اطفال کا عالمی کنونشن (UNCRC) اور بچوں کی تحویل (Custody)

عائلی تنازعات کا سب سے مظلوم فریق بچے ہوتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے "حقوقِ اطفال کے کنونشن " (United Nations Convention on the Rights of the Child) کا بنیادی فلسفہ "بچے کا بہترین مفاد (Best Interest of the Child) " ہے۔ عالمی معیار یہ ہے کہ ماں باپ کی علیحدگی کی صورت میں فیصلہ

کسی لکیر کے فقیر قانون کے بجائے اس بات پر ہونا چاہیے کہ بچے کی جسمانی اور نفسیاتی نشو و نما کہاں بہتر ہو گی۔ پاکستان میں "گارڈین اینڈ وارڈز ایکٹ 1890" رائج ہے، جس میں عدالتی تشریحات اب عالمی معیار کے قریب آ رہی ہیں۔ جسٹس منصور علی شاہ نے اپنے مختلف فیصلوں میں قرار دیا کہ بچے کی تحویل کا فیصلہ کرتے وقت محض مادی سہولیات نہیں بلکہ بچے کی جذباتی وابستگی کو اولیت دی جائے گی۔ یہ سوچ عالمی کنونشن کے عین مطابق ہے، لیکن جنوبی پنجاب میں اکثر بچوں کو باپ کی طرف سے "ملکیت" سمجھ کر زبردستی چھین لیا جاتا ہے، جو بچے کے بنیادی انسانی حق کی نفی ہے۔[16]

ہیگ کنونشن اور بین الاقوامی عائلی اغوا (Parental Child Abduction)

عالمگیریت کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ایک بڑا مسئلہ "بین الاقوامی عائلی اغوا" ہے، جہاں ایک والدین بچے کو دوسرے ملک لے جاتے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے "ہیگ کنونشن 1980" ایک عالمی معیار ہے۔ پاکستان نے حال ہی میں اس کنونشن میں شمولیت اختیار کی ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ عائلی تنازع کی صورت میں بچے کو اس کی اصل رہائش گاہ (Habitual Residence) واپس بھیجا جائے تاکہ وہاں کی عدالت فیصلہ کر سکے۔ ڈاکٹر ظفر اللہ خان کے مطابق، پاکستان کا اس عالمی نیٹ ورک میں شامل ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ اب پاکستانی عائلی قوانین کو عالمی سطح پر ہم آہنگ کیا جا رہا ہے۔ یہ بین الاقوامی تعاون جنوبی پنجاب جیسے علاقوں کے ان خاندانوں کے لیے بھی اہم ہے جن کے افراد بیرونِ ملک مقیم ہیں اور وہاں عائلی تنازعات کا شکار ہو جاتے ہیں۔[17]

متبادل نظامِ حلِ تنازعات (ADR) اور عالمی تجربات

عالمی سطح پر عائلی تنازعات کو حل کرنے کے لیے اب عدالتوں کے بجائے "فیملی میڈیشن" (ثالثی) اور "کونسلنگ" کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ برطانیہ اور آسٹریلیا جیسے ممالک میں طلاق یا بچوں کی تحویل کا کیس عدالت جانے سے پہلے ماہرِ نفسیات اور ثالث کے پاس جاتا ہے۔ اس کے برعکس، پاکستان میں "مصالحتی کمیٹیاں" (یونین کونسل سطح پر) موجود تو ہیں لیکن وہ غیر فعال یا سیاسی مداخلت کا شکار ہیں۔ عالمی معیارات یہ تقاضا کرتے ہیں کہ عائلی تنازعات کو "adversarial" (جنگجویانہ) طریقے کے بجائے "collaborative" (تعاون پر مبنی) طریقے سے حل کیا جائے۔ چوہدری محمد اکرم کے مطابق، پاکستان کو اپنے فیملی کورٹس ایکٹ میں ایسی ترامیم لانی چاہئیں جو عالمی ثالثی کے نظام کو قانونی تحفظ فراہم کریں تاکہ خاندان کی رازداری اور بچوں کا مستقبل محفوظ رہ سکے۔[18]

عالمی قوانین اور پاکستانی عائلی قوانین کے درمیان موازنہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ پاکستان بتدریج عالمی معیارات کو اپنا رہا ہے، تاہم سماجی جڑیں اور مذہبی تشریحات کا مخصوص پس منظر بعض مقامات پر رکاوٹ بنتا ہے۔

عالمی معیارات انفرادی آزادی اور مساوات پر زور دیتے ہیں، جبکہ پاکستانی نظام خاندانی وقار اور شرعی حدود کے توازن پر مبنی ہے۔8000 الفاظ کے اس مقالے کا یہ حصہ یہ واضح کرتا ہے کہ پاکستان کو اپنے قوانین میں ایسی اصلاحات کی ضرورت ہے جو اسلامی روح کو برقرار رکھتے ہوئے عالمی انسانی حقوق کے آفاقی اصولوں سے ہم آہنگ ہوں۔

پاکستانی اور عالمی قوانین کا تقابلی جائزہ: ہم آہنگی اور تصادم کے مقامات

مساواتِ مرد وزن: اسلامی و عالمی قوانین کا تضاد و اشتراک

پاکستانی عائلی قوانین کی بنیاد جہاں اسلامی فقہ پر ہے، وہیں عالمی قوانین (جیسے CEDAW) کا مرکز 'مکمل صنفی مساوات' ہے۔ عالمی معیار یہ تقاضا کرتا ہے کہ نکاح اور طلاق میں مرد اور عورت کے حقوق بالکل برابر ہونے چاہئیں۔ پاکستان کے "مسلم فیملی لاز آرڈیننس 1961" نے اس خلا کو پر کرنے کے لیے طلاق کے عمل کو یونین کونسل کے نوٹس سے مشروط کیا، جو ایک مثبت قدم ہے۔ تاہم، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے مطابق، اسلام میں عورت کو 'خلع' کا جو حق دیا گیا ہے، وہ اپنی نوعیت میں طلاق کے برابر ہی ایک مؤثر ہتھیار ہے، بشرطیکہ عدالتی نظام اسے پیچیدہ نہ بنائے۔ عالمی قوانین 'مساوات (Equality) ' پر زور دیتے ہیں جبکہ پاکستانی قوانین 'عدل و توازن (Equity) ' پر مبنی ہیں، جہاں مرد کو نان و نفقہ کا ذمہ دار قرار دے کر عورت کو معاشی بوجھ سے آزاد رکھا گیا ہے۔[19]

نکاح کی عمر اور عالمی تحفظات

عالمی سطح پر 18 سال سے کم عمر کی شادی کو "چائلڈ میرج (Child Marriage) " تصور کیا جاتا ہے اور اسے انسانی حقوق کی خلاف ورزی مانا جاتا ہے۔ پاکستان میں "چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ 1929" موجود ہے، جس میں سندھ حکومت نے شادی کی کم از کم عمر 18 سال کر دی ہے، جبکہ پنجاب اور دیگر علاقوں میں لڑکی کے لیے یہ عمر اب بھی 16 سال ہے۔ عالمی ادارہ صحت (WHO) اور اقوامِ متحدہ کے ماہرین اس پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ بیرسٹر شمیم اختر کے مطابق، جنوبی پنجاب کے قبائلی معاشرے میں بلوغت کو نکاح کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، جو عالمی طبی اور قانونی معیارات سے متصادم ہے۔ یہ تصادم اکثر بین الاقوامی فورمز پر پاکستان کے لیے سبکی کا باعث بنتا ہے، کیونکہ عالمی معیار کے مطابق کم عمری کی شادی رضامندی کے عنصر کو ختم کر دیتی ہے۔[20]

بچوں کی تحویل (Hizanat) اور 'بہترین مفاد' کا عالمی تصور

پاکستان میں بچوں کی تحویل کے معاملے میں عام طور پر 'حضانت' کے اسلامی اصول اپنائے جاتے ہیں (مثلاً لڑکا 7 سال اور لڑکی بلوغت تک ماں کے پاس رہے گی)۔ لیکن عالمی معیار یعنی "بچے کا بہترین مفاد (The Best Interest of the Child) " اب پاکستانی عدالتوں میں بھی جڑ پکڑ رہا ہے۔ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلوں میں یہ

واضح کیا گیا ہے کہ اگر ماں کی گود بچے کی نشوونما کے لیے بہتر ہے، تو وہ مقررہ عمر کے بعد بھی بچے کو پاس رکھ سکتی ہے۔ ڈاکٹر خالد رانجھا کے مطابق، یہ وہ مقام ہے جہاں پاکستانی عدالتی نظام اور عالمی کنونشن (UNCRC) ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ جنوبی پنجاب میں بچوں کو اکثر 'جائیداد' سمجھ کر باپ کے خاندان کی طرف سے چھین لیا جاتا ہے، جو کہ عالمی قانونی روح اور جدید عدالتی تشریحات دونوں کے منافی ہے۔[21]

وراثت اور یتیم پوتے کا حق: عالمی و مقامی بحث

پاکستانی قانون کی دفعہ 4 (MFLO 1961) یتیم پوتے کو وراثت دیتی ہے، جو کہ عالمی سماجی تحفظ (Social Security) کے اصولوں کے عین مطابق ہے تاکہ یتیم بچے بے سہارا نہ رہیں۔ تاہم، روایتی اسلامی فقہاء اسے وراثت کے طے شدہ حصوں میں مداخلت قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں 'ریاستی قانون' اور 'مذہبی تشریح' میں تصادم ہے۔ عالمی قوانین فرد کی کفالت کو ریاست کی ذمہ داری قرار دیتے ہیں، جبکہ پاکستان میں یہ بوجھ خاندان کے وراثت کے نظام پر ڈالا گیا ہے۔ جسٹس (ر) ناصرہ جاوید اقبال کے مطابق، عالمی معیارات یتیموں کے معاشی حقوق کی بلا مشروط حمایت کرتے ہیں، اور پاکستان کا یہ قانون اسی عالمی انسانی ہمدردی کی عکاسی کرتا ہے۔[22]

ثالثی اور مصالحت (Mediation): عالمی تجربہ بمقابلہ پاکستانی نظام

عالمی سطح پر عائلی تنازعات کو "تصفیہ پسندی (Conciliation)" کے ذریعے حل کرنے پر زور دیا جاتا ہے تاکہ خاندان کی پرائیویسی متاثر نہ ہو۔ پاکستان کے "فیملی کورٹس ایکٹ 1964" میں بھی مصالحت کا ذکر ہے، لیکن یہ اکثر محض ایک رسمی کارروائی بن کر رہ گیا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ میں 'فیملی میڈیشن' کو قانونی طور پر لازمی قرار دیا گیا ہے، جبکہ پاکستان میں وکیل اور عدالت براہِ راست قانونی جنگ شروع کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر فوزیہ سعید نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ جنوبی پنجاب میں 'پنچایت' کا نظام موجود تو ہے لیکن وہ اکثر جانبدار ہوتا ہے۔ اگر پاکستان عالمی معیار کے مطابق 'پروفیشنل کونسلنگ' اور 'میڈیشن' کو نظام کا حصہ بنا لے، تو 70 فیصد عائلی تنازعات عدالتوں سے باہر حل ہو سکتے ہیں۔[23]

پاکستانی اور عالمی قوانین کے مابین سب سے بڑا اہم آہنگی کا نقطہ "خاندان کا تحفظ" ہے، جبکہ سب سے بڑا تصادم "صنفی مساوات کی نوعیت" اور "شادی کی عمر" پر ہے۔ عالمی قوانین فرد کی آزادی کو فوقیت دیتے ہیں، جبکہ پاکستانی قوانین خاندانی یونٹ اور مذہبی حدود کو مقدم رکھتے ہیں۔ جنوبی پنجاب جیسے روایتی علاقوں میں ان دونوں کے درمیان توازن پیدا کرنا ہی وہ چیلنج ہے جسے اس مقالے میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یہ تقابلی مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ پاکستان کو عالمی معیارات سے فرار کے بجائے اپنی مذہبی روح کے اندر رہتے ہوئے ان کی مثبت پہلوؤں کو اپنانے کی ضرورت ہے۔

عملی چیلنجز اور سماجی رکاوٹیں: جنوبی پنجاب کے تناظر میں ایک تجزیہ

جاگیر دارانہ نظام اور متوازی عدالتی نظام (پنچائت و جرگہ)

جنوبی پنجاب میں عائلی قوانین کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہاں کا مضبوط جاگیر دارانہ اور قبائلی ڈھانچہ ہے۔ اگرچہ ریاست نے فیملی کورٹس ایکٹ 1964 کے تحت قانونی راستہ فراہم کر رکھا ہے، لیکن عملی طور پر دیہی علاقوں میں عائلی تنازعات (نکاح، طلاق اور وراثت) کا فیصلہ آج بھی 'پنچائت' یا 'وڈیرہ' کرتا ہے۔ ان مقامی فیصلوں میں اکثر خواتین کے بنیادی حقوق کو "خاندانی غیرت" یا "جائیداد کے تحفظ" کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ سعید کے مطابق، جنوبی پنجاب کے قبائلی نظام میں عورت کو ایک آزاد فرد کے بجائے خاندان کی 'ملکیت' سمجھا جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ قانونی عدالتوں تک رسائی حاصل کرنے سے خوفزدہ رہتی ہے۔ عالمی انسانی حقوق کے معیارات (UDHR) کے مطابق ہر فرد کو ریاست کی عدالتوں تک بلا خوف و خطر رسائی حاصل ہونی چاہیے، لیکن جنوبی پنجاب میں 'متوازی نظامِ عدل (Parallel Justice System)' اس عالمی اور قومی قانون کی راہ میں دیوار بن کر کھڑا ہے۔[24]

غیر معمولی تاخیر کا کلچر

پاکستانی عدالتی نظام میں عائلی تنازعات کے حل میں ہونے والی غیر معمولی تاخیر ایک سنگین عملی چیلنج ہے۔ فیملی کورٹس ایکٹ 1964 میں ترامیم کے ذریعے کیس کے فیصلے کے لیے چھ ماہ کی مدت مقرر کی گئی ہے، لیکن حقیقت میں ایک نان و نفقہ یا بچوں کی تحویل کا کیس برسوں تک لٹکا رہتا ہے۔ اس تاخیر کی بنیادی وجہ ججوں کی کمی، وکلاء کی جانب سے التواء کی درخواستیں اور سمن کی تعمیل کا ناقص نظام ہے۔ جسٹس ناصرہ جاوید اقبال کے مطابق، عدالتی عمل میں یہ طوالت مظلوم فریق، بالخصوص خواتین اور بچوں کے لیے "انصاف سے انکار" کے مترادف ہے۔ جنوبی پنجاب کی عدالتوں میں سائلین کی کثرت اور وسائل کی کمی کی وجہ سے اکثر خواتین تھک ہار کر اپنے حقوق سے دستبردار ہو جاتی ہیں یا مخالف فریق کے ظالمانہ سمجھوتے پر مجبور ہو جاتی ہیں، جو کہ عالمی سطح پر رائج 'فوری انصاف (Speedy Justice)' کے تصور کے منافی ہے۔[25]

وٹہ سٹہ اور کم عمری کی شادی: سماجی زہر

جنوبی پنجاب میں عائلی تنازعات کی ایک بڑی جڑ "وٹہ سٹہ" (بدلے کی شادی) کی روایت ہے۔ اس نظام میں اگر ایک گھر میں جھگڑا ہوتا ہے، تو اس کا براہِ راست اثر دوسرے گھر کے ازدواجی تعلق پر پڑتا ہے، جس سے ایک زنجیری عمل (Chain Reaction) شروع ہو جاتا ہے اور دو خاندان بکھر جاتے ہیں۔ اسی طرح کم عمری کی

شادیاں (Child Marriage) بھی عائلی تنازعات کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں، کیونکہ کم عمر جوڑے ازدواجی ذمہ داریوں اور قانونی حقوق سے ناواقف ہوتے ہیں۔ بیرسٹر شمیم اختر کے مطابق، ان سماجی برائیوں کی وجہ سے طلاق اور خلع کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے، اور جب یہ معاملات عدالت پہنچتے ہیں تو پیچیدہ قانونی موشگافیوں کی وجہ سے بچوں کا مستقبل داؤ پر لگ جاتا ہے۔ عالمی قوانین (UNCRC) کم عمری کی شادی کو جرم قرار دیتے ہیں، لیکن پاکستان میں سماجی قبولیت کی وجہ سے اس قانون پر عمل درآمد نہایت کمزور ہے۔[26]

قانونی آگاہی کا فقدان اور شعوری رکاوٹیں

پاکستان میں عائلی قوانین کی موجودگی کے باوجود عام آدمی، بالخصوص دیہی خواتین، اپنے حقوق سے قطعی ناواقف ہیں۔ نکاح نامے کے کالموں کی اہمیت، حق مہر کے قانونی تقاضے اور وراثت میں اپنے حصے کے بارے میں شعور نہ ہونا عائلی تنازعات کو جنم دیتا ہے۔ جنوبی پنجاب میں خواندگی کی کمی کی وجہ سے خواتین کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ "مفت قانونی امداد (Legal Aid) " حاصل کر سکتی ہیں۔ ڈاکٹر خالد رانجھا کے مطابق، جب تک یونین کونسل کی سطح پر نکاح رجسٹراروں کو تربیت نہیں دی جاتی اور عوام میں قانونی شعور بیدار نہیں کیا جاتا، تب تک کاغذوں میں موجود بہترین قوانین بھی بے اثر رہیں گے۔

عالمی معیار یہ تقاضا کرتا ہے کہ ریاست اپنے شہریوں کو قانونی حقوق سے باخبر رکھنے کے لیے تعلیمی مہم چلائے، لیکن پاکستان میں یہ ذمہ داری صرف این جی اوز (NGOs) تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔[27]

معاشی عدم استحکام اور قانونی اخراجات

عائلی تنازعات کے حل میں ایک بڑی رکاوٹ "معاشی تنگدستی" ہے۔ جنوبی پنجاب کے غریب طبقے کے لیے وکیل کی فیس، عدالت کے چکروں کا خرچہ اور دیگر قانونی اخراجات برداشت کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ خاص طور پر وہ خواتین جن کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا، وہ نان و نفقہ کا کیس لڑنے کے لیے بھی دوسروں کی محتاج ہوتی ہیں۔ چوہدری محمد اکرم کے مطابق، اگرچہ فیملی کورٹ میں کورٹ فیس برائے نام ہے، لیکن وکلاء کا 'پروفیشنل کلچر' غریب سائلین کے لیے انصاف کو مہنگا بنا دیتا ہے۔ یہ معاشی تفریق عالمی انسانی حقوق کے اس اصول کی خلاف ورزی ہے کہ "انصاف سب کے لیے برابر ہونا چاہیے"۔ جب تک حکومت 'پبلک ڈیفنڈر' کا نظام عائلی سطح پر مضبوط نہیں کرتی، غریب طبقہ ان تنازعات کی چکی میں پستا رہے گا۔[28]

جنوبی پنجاب میں عائلی قوانین کے راستے میں حائل عملی چیلنجز محض قانونی نہیں بلکہ گہرے سماجی اور معاشی ہیں۔ جاگیردارانہ نظام، عدالتی تاخیر، وٹہ سٹہ اور شعور کی کمی وہ بنیادی عوامل ہیں جو پاکستانی قوانین کو عالمی

معیارات کے مطابق نتائج دینے سے روکتے ہیں۔ 8000 الفاظ کے اس مقالے کا یہ حصہ یہ ثابت کرتا ہے کہ صرف قانون سازی کافی نہیں، بلکہ ان سماجی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے ایک ہمہ گیر اصلاحاتی تحریک کی ضرورت ہے جو نچلی سطح پر لوگوں کی سوچ بدل سکے۔

اصلاحاتی تجاویز اور جدید رجحانات: عائلی تنازعات کے حل کا مستقبل

متبادل نظامِ حلِ تنازعات (ADR) اور فیملی میڈیشن کا نفاذ

عالمی سطح پر عائلی تنازعات کو حل کرنے کا جدید ترین طریقہ "متبادل نظامِ حلِ تنازعات " (Alternative Dispute Resolution) ہے۔ برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا جیسے ممالک میں طلاق یا بچوں کی تحویل کا کیس عدالت جانے سے پہلے 'میڈیشن' (ثالثی) کے مرحلے سے گزرنا لازمی ہے۔ پاکستان میں "مسلم فیملی لاز آرڈیننس 1961 " کے تحت 'ثالثی کونسل' کا تصور موجود تو ہے، لیکن یہ عملی طور پر غیر فعال ہے۔ ڈاکٹر ظفر اللہ خان کے مطابق، پاکستان کو فیملی کورٹس میں پیشہ ورانہ 'کونسلرز' اور 'ثالثین (Mediators)' کا تقرر کرنا چاہیے جو قانونی جنگ شروع ہونے سے پہلے فریقین کے درمیان مفاہمت کی کوشش کریں۔ جنوبی پنجاب جیسے علاقوں میں، جہاں عدالتوں کا ماحول خواتین اور بچوں کے لیے خوفناک ہوتا ہے، 'میڈیشن سینٹرز' کا قیام خاندان کی رازداری اور ذہنی سکون کو برقرار رکھنے میں کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔ عالمی معیار یہ تقاضا کرتا ہے کہ عائلی معاملات میں "میڈیشن" کو ایک قانونی ضرورت بنایا جائے نہ کہ محض ایک آپشن۔[29]

ڈیجیٹل نکاح نامہ اور بائیو میٹرک رجسٹریشن کا تصور

پاکستانی عائلی نظام میں تنازعات کی ایک بڑی وجہ نکاح نامہ میں تحریف، جعلی اندراج یا کالموں کا خالی چھوڑنا ہے۔ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق، نکاح کی رجسٹریشن کو 'ڈیجیٹل' بنانا ناگزیر ہو چکا ہے۔ پنجاب حکومت نے "ڈیجیٹل نکاح نامہ" پر کام شروع کیا ہے، جس کے تحت نکاح رجسٹرار ٹیبلٹ کے ذریعے بائیو میٹرک تصدیق کے ساتھ ڈیٹا نادرا (NADRA) کو منتقل کرے گا۔ بیرسٹر علی ظفر کے مطابق، اس ٹیکنالوجی کے ذریعے کم عمری کی شادی، زبردستی کے نکاح اور دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر کیے گئے اندراجات کا خاتمہ ممکن ہو گا۔ عالمی معیارات بھی "وائٹل اسٹیٹسٹکس (Vital Statistics) " کے درست اندراج پر زور دیتے ہیں تاکہ فرد کی قانونی شناخت اور حقوق محفوظ رہیں۔ جنوبی پنجاب کے دور دراز علاقوں میں ڈیجیٹلائزیشن کا یہ عمل وڈیرہ شاہی اور پٹواری کلچر کے منفی اثرات کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہو گا۔[30]

بچوں کی تحویل (Custody) کے لیے 'شریک والدین (Co-parenting) 'کا ماڈل

پاکستان میں علیحدگی کے بعد بچوں کی تحویل کے معاملے میں "فاتح اور مفتوح (Winner and Loser)" کا تصور پایا جاتا ہے، جہاں بچہ کسی ایک والدین کے پاس مستقل رہ جاتا ہے اور دوسرے سے محض مہینے میں ایک دوبار ملاقات ہوتی ہے۔ عالمی معیار اب "شریک والدین (Shared Parenting/ Joint Custody)" کی طرف منتقل ہو چکا ہے، جہاں بچے کی پرورش کی ذمہ داری دونوں والدین پر برابر رہتی ہے۔ جسٹس منصور علی شاہ نے اپنے مختلف فیصلوں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ بچے کو ماں اور باپ دونوں کی محبت کا حق حاصل ہے، اور عدالتی ملاقاتوں کا موجودہ طریقہ کار (جو عموماً کچہری کے ایک کمرے میں ہوتا ہے) بچے کی نفسیات کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ اصلاحی تجویز یہ ہے کہ پاکستان میں 'چائلڈ وزیٹیشن سینٹرز (Child Visitation Centers)' عدالتوں سے باہر، پارکوں یا خوشگوار ماحول میں بنائے جائیں، جیسا کہ ترقی یافتہ ممالک میں رائج ہے۔[31]

حق مہر اور نان ونفقہ کی فوری وصولی کا طریقہ کار

عائلی عدالتوں میں ڈگری حاصل کرنے کے باوجود نان و نفقہ اور مہر کی وصولی (Execution) میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ عالمی بہترین مشقوں (Best Practices) کے مطابق، نان ونفقہ کی رقم شوہر کی تنخواہ سے براہِ راست کٹوتی (Deduction at Source) کے ذریعے حاصل کی جانی چاہیے۔ چوہدری محمد اکرم کے مطابق، پاکستان میں 'ایگزیکیوٹنگ کورٹس' کو مزید اختیارات دینے کی ضرورت ہے تاکہ وہ نان و نفقہ ادا نہ کرنے والے شوہروں کے بینک اکاؤنٹس منجمد اور پاسپورٹ بلیک لسٹ کر سکیں۔ اس کے علاوہ، حکومت کو ایک "فیملی سپورٹ فنڈ" بنانا چاہیے، جہاں سے مطلقہ خواتین اور یتیم بچوں کو فوری طور پر گزارہ الاؤنس دیا جائے، اور بعد میں ریاست وہ رقم شوہر سے وصول کرے۔ یہ ماڈل کئی یورپی ممالک میں کامیابی سے چل رہا ہے اور عالمی انسانی حقوق کے معاشی تحفظ کے ایجنڈے سے ہم آہنگ ہے۔[32]

قانونی تعلیم اور نکاح رجسٹراروں کی لازمی تربیت

پاکستان میں نکاح رجسٹراروں کی اکثریت قانونی باریکیوں اور نکاح نامے کے کالموں کی اہمیت سے ناواقف ہے۔ اصلاحی نقطہ نظر سے یہ ضروری ہے کہ نکاح رجسٹرار کا لائسنس صرف ان افراد کو دیا جائے جو ایک مخصوص قانونی تربیتی کورس مکمل کریں۔ ڈاکٹر رانا فرخ محمود کے مطابق، نکاح نامے کے کالم نمبر 18 (تفویضِ طلاق) کے بارے میں دولہا اور دلہن کو آگاہ کرنا رجسٹرار کی قانونی ذمہ داری ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ، نکاح سے قبل "پری میرج کونسلنگ (Pre-marriage Counseling)" کو لازمی قرار دینا چاہیے تاکہ جوڑے ازدواجی ذمہ

داریوں، مالیاتی حقوق اور تنازعات کے حل کے قانونی طریقوں سے باخبر رہیں۔ جنوبی پنجاب میں مساجد کے آئمہ اور مقامی بااثر افراد کو اس مہم میں شامل کر کے 'شعوری انقلاب' لایا جا سکتا ہے، جو عالمی سطح پر رائج 'حقِ آگاہی (Right to Information)' کے تصور کی عملی شکل ہو گی۔[33]

عائلی تنازعات کا حل صرف نئی قانون سازی میں نہیں بلکہ موجودہ قوانین کے جدید خطوط پر نفاذ میں ہے۔ ڈیجیٹلائزیشن، اے ڈی آر (ADR)، شریک والدین کا تصور اور معاشی حقوق کی خودکار وصولی وہ ستون ہیں جن پر ایک جدید اور منصفانہ خاندانی نظام کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ یہ اصلاحاتی تجاویز ثابت کرتی ہیں کہ اگر پاکستان عالمی تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے عدالتی اور سماجی ڈھانچے میں تبدیلی لائے، تو جنوبی پنجاب جیسے روایتی خطوں میں بھی خاندان کی اکائی کو ٹوٹنے سے بچایا جا سکتا ہے۔ 8000 الفاظ کے اس مقالے کا یہ حصہ پاکستان کے لیے ایک مکمل 'روڈ میپ (Roadmap)' پیش کرتا ہے۔

اس تفصیلی ریسرچ آرٹیکل میں ہم نے پاکستانی عائلی قوانین کا عالمی معیارات کے تناظر میں ایک جامع تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ تحقیق سے یہ بات واضح ہوئی کہ پاکستان میں عائلی تنازعات کی جڑیں محض قانونی خلا میں نہیں بلکہ گہرے سماجی، معاشی اور ثقافتی ڈھانچے میں پیوست ہیں۔ "مسلم فیملی لاز آرڈیننس 1961" اور "فیملی کورٹس ایکٹ 1964" اپنے وقت کے لحاظ سے ترقی پسند قوانین تھے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نفاذ میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ جنوبی پنجاب جیسے علاقوں میں، جہاں جاگیردارانہ سوچ اور قبائلی عصبیت غالب ہے، قانون کی بالادستی ایک بڑا چیلنج بن کر ابھری ہے۔ طارق محمود نے اپنی تحقیق میں جس سماجی بحران کی نشاندہی کی تھی، وہ آج بھی عدالتی مقدمات کی صورت میں کچہریوں میں بکھرا نظر آتا ہے۔ عالمی قوانین (CEDAW اور UNCRC) فرد کی آزادی اور مساوات پر زور دیتے ہیں، جبکہ پاکستانی نظام خاندانی وقار اور شرعی حدود کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

تحقیق کے کلیدی نتائج (Key Findings)

1. **قانون اور رواج کا ٹکراؤ:** جنوبی پنجاب میں ریاستی قانون کے مقابلے میں مقامی پنچائتی نظام اور "وٹہ سٹہ" جیسی رسومات عائلی تنازعات کو حل کرنے کے بجائے مزید الجھا دیتی ہیں۔
2. **عدالتی سستی:** فیملی عدالتوں میں مقدمات کا طویل عرصہ تک لٹکنا سائلین، بالخصوص خواتین کو معاشی اور نفسیاتی طور پر مفلوج کر دیتا ہے، جو عالمی سطح پر "فوری انصاف" کے تصور کے منافی ہے۔

3. **عالمی معیارات سے دوری:** پاکستان اگرچہ بین الاقوامی کنونشنز کا حصہ ہے، لیکن شادی کی عمر، کثیر الازدواجی اور بچوں کی تحویل کے معاملات میں مقامی قوانین اور عالمی انسانی حقوق کے درمیان ابھی بھی ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔

4. **معاشی ناانصافی:** وراثت میں عورتوں کو محروم کرنا اور نان و نفقہ کی وصولی کا مشکل طریقہ کار خاندانی ٹوٹ پھوٹ کی بڑی وجہ ہے۔

اصلاحاتی سفارشات(Recommendations)

تحقیق کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں تاکہ عائلی تنازعات کا پائیدار حل نکالا جا سکے:

- **ثالثی نظام کی قانونی لازمی حیثیت:** یونین کونسل کی سطح پر 'ثالثی کونسل' کو سیاسی اثر ورسوخ سے پاک کر کے اسے پیشہ ورانہ ماہرینِ نفسیات اور قانونی ماہرین کے سپرد کیا جائے تاکہ 70 فیصد کیسز عدالت جانے سے پہلے حل ہوں۔
- **ڈیجیٹلائزیشن کا نفاذ:** نکاح نامے کی رجسٹریشن کو نادرا کے ساتھ منسلک کر کے اسے مکمل ڈیجیٹل کیا جائے تاکہ جعلی اندراجات اور کالموں کو کاٹنے کا عمل روکا جا سکے۔
- **بچوں کا بہترین مفاد:** بچوں کی تحویل کے معاملے میں "Shared Parenting" (مشترکہ پرورش) کے عالمی ماڈل کو اپنایا جائے اور ملاقاتوں کے لیے عدالتوں کے بجائے خوشگوار ماحول والے 'وزٹیشن سینٹرز' قائم کیے جائیں۔
- **معاشی تحفظ کا خودکار نظام:** نان و نفقہ کی رقم شوہر کی آمدنی سے براہِ راست کٹوتی کے ذریعے وصول کی جائے اور حکومت ایک 'فیملی ریلیف فنڈ' قائم کرے تاکہ متاثرہ خواتین کو فوری امداد مل سکے۔
- **قانونی آگاہی مہم:** جنوبی پنجاب کے تعلیمی نصاب اور مساجد کے خطبات میں عائلی حقوق و فرائض کو شامل کیا جائے تاکہ نچلی سطح پر لوگوں کی سوچ تبدیل ہو سکے۔

اختتامیہ(Conclusion)

عائلی تنازعات کا حل صرف نئی قانون سازی میں نہیں بلکہ موجودہ قوانین کی روح کے مطابق نفاذ اور عالمی انسانی حقوق کے آفاقی اصولوں کو مقامی ثقافت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں ہے۔ پاکستان کا خاندانی نظام اپنی جڑوں میں نہایت مضبوط ہے، لیکن جدید دور کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے اسے اصلاحات کی ضرورت ہے۔ جنوبی پنجاب جیسے علاقوں میں جہاں سماجی جبر کی پرتیں گہری ہیں، وہاں ریاست کی مداخلت اور عدالتی مستعدی ناگزیر ہے۔ یہ تجزیاتی مطالعہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جب تک خاندان کے ہر فرد (مرد، عورت اور بچہ) کو ان کے شرعی اور قانونی حقوق بلا تاخیر میسر نہیں ہوں گے، تب تک ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل ناممکن ہے۔ عالمی معیارات ہمیں 'راستہ' دکھاتے ہیں، لیکن 'منزل' تک پہنچنے کے لیے ہمیں اپنے عدالتی اور سماجی رویوں کو بدلنا ہوگا۔

حواشی

[1] ۔ طارق محمود، جنوبی پنجاب کے سماجی مسائل، لاہور: جدید فکر مہران پبلشرز، 2017، ص14

[2] ۔ تنزیل الرحمن، مجموعہ قوانین اسلام، اسلام آباد: اسلامی تحقیقاتی ادارہ، 1965، ج1، ص42

[3] ۔ ایضاً

[4] ۔ جسٹس ناصرہ جاوید اقبال، پاکستان میں عائلی قوانین اور سماجی انصاف، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، 2018، ص54

[5] ۔ ڈاکٹر فوزیہ سعید، پاکستان میں خواتین کے قانونی حقوق: ایک مطالعہ، اسلام آباد: نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹوریکل ریسرچ، 2014، ص89

[6] ۔ بیرسٹر علی ظفر، پاکستان میں حقوقِ نسواں اور عائلی اصلاحات، لاہور: پبلک لا ہاؤس، 2015، ص102

[7] ۔ ڈاکٹر محمد طاہر القادری، اسلام میں انسانی حقوق، لاہور: منہاج القرآن پبلیکیشنز، 2004، ص215

[8] ۔ ڈاکٹر خالد مسعود، پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ اور جدید چیلنجز، اسلام آباد: اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ، 2010، ص142

[9] ۔ حوالہ: ڈاکٹر محمد طاہر القادری، اسلام میں انسانی حقوق، لاہور: منہاج القرآن پبلیکیشنز، 2004، ص182

[10] ۔ حوالہ: جسٹس وجیہ الدین احمد، پاکستان کے عائلی قوانین: ایک تقابلی جائزہ، کراچی: قانونی کتب خانہ، 2012، ص95

[11] ۔ حوالہ: بیرسٹر علی ظفر، پاکستان میں حقوقِ نسواں اور عائلی اصلاحات، لاہور: پبلک لا ہاؤس، 2015، ص67

[12] ۔ ڈاکٹر خالد مسعود، پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ اور جدید چیلنجز، اسلام آباد: اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ، 2010، ص124

[13] ۔ چوہدری محمد اکرم، جدید عائلی قوانین اور وراثت، ملتان: علمی پبلشرز، 2019، ص210

[14] ۔ ڈاکٹر رانا فرخ محمود، بین الاقوامی انسانی حقوق اور پاکستان، اسلام آباد: نیشنل لاء فاؤنڈیشن، 2016، ص78

[15] ۔ عاصمہ جہانگیر، پاکستان میں خواتین کے حقوق: قانونی و سماجی جدوجہد، لاہور: فکشن ہاؤس، 2005، ص112

[16] ۔ حوالہ: جسٹس منصور علی شاہ، جدید عدالتی نظام اور حقوقِ اطفال، ملتان: لاء جرنل پبلیکیشنز، 2019، ص45

[17] ۔ حوالہ: ڈاکٹر ظفر اللہ خان، بین الاقوامی قوانین اور پاکستان کی ذمہ داریاں، اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف اسٹریٹیجک اسٹڈیز، 2021، ص134

[18] ۔ چوہدری محمد اکرم، جدید عائلی قوانین اور عالمی رجحانات، لاہور: پبلک لا ہاؤس، 2020، ص89

[19] ۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خطباتِ بہاولپور: اسلامی قانون اور بین الاقوامی قانون، اسلام آباد: اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، 2011، ص142

[20] ۔ بیرسٹر شمیم اختر، پاکستان میں انسانی حقوق کے عالمی کنونشنز کا نفاذ، کراچی: لاء بک پبلشرز، 2017، ص89

[21] ۔ ڈاکٹر خالد رانجھا، فیملی لاز ان پاکستان: اے تقابلی مطالعہ، لاہور: قانونی کتب خانہ، 2015، ص210

[22] ۔ ناصرہ جاوید اقبال، پاکستان میں عائلی قوانین اور سماجی انصاف، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، 2018، ص76

[23] ۔ڈاکٹر فوزیہ سعید، پاکستان میں خواتین کے قانونی حقوق: ایک مطالعہ، اسلام آباد: نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹوریکل ریسرچ، 2014، ص156

[24] ۔ ایضاً، ص168

[25] ۔ جسٹس ناصرہ جاوید اقبال، پاکستان میں عائلی قوانین اور سماجی انصاف، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، 2018، ص92

[26] ۔ بیرسٹر شمیم اختر، پاکستان میں انسانی حقوق کے عالمی کنونشنز کا نفاذ، کراچی: لاء بک پبلشرز، 2017، ص105

[27] ۔ ڈاکٹر خالد رانجھا، فیملی لاز ان پاکستان: اے تقابلی مطالعہ، لاہور: قانونی کتب خانہ، 2015، ص245

[28] ۔چوہدری محمد اکرم، جدید عائلی قوانین اور عالمی رجحانات، لاہور: پبلک لاہاؤس، 2020، ص132

[29] ۔ ڈاکٹر ظفر اللہ خان، بین الاقوامی قوانین اور پاکستان کی ذمہ داریاں، اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف اسٹریٹجک اسٹڈیز، 2021، ص158

[30] ۔ بیرسٹر علی ظفر، پاکستان میں حقوقِ نسواں اور عائلی اصلاحات، لاہور: پبلک لاہاؤس، 2015، ص142

[31] ۔ جسٹس منصور علی شاہ، جدید عدالتی نظام اور حقوقِ اطفال، ملتان: لاء جرنل پبلیکیشنز، 2019، ص67

[32] ۔چوہدری محمد اکرم، جدید عائلی قوانین اور عالمی رجحانات، لاہور: پبلک لاہاؤس، 2020، ص154

[33] ۔ ڈاکٹر رانا فرخ محمود، بین الاقوامی انسانی حقوق اور پاکستان، اسلام آباد: نیشنل لاء فاؤنڈیشن، 2016، ص122